ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں میں دھرتی کا تصور

ڈاکٹر فریدہ عثمان (لیکچرار اردو، محکمہ اعلیٰ تعلیم خیبر پختونخوا)
ڈاکٹر نیلم (ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، محکمہ اعلیٰ تعلیم خیبر پختونخوا)
ڈاکٹر فاطمہ حیات (اسسٹنٹ پروفیسر اردو، محکمہ اعلیٰ تعلیم خیبر پختونخوا)

Abstract:

The 'Concept of **DHARTI** (دھرتی)in the poetry of Dr. Wazir Agha delves into the profound human experience of belonging and the universal yearning for connection to our civilizational roots. This paper explores how Wazir Agha frames the DHARTI not just as landscape, but as the beating heart of humanity's shared consciousness, linking us to deep, ancestral memories. He courageously confronts the spiritual poverty and emotional detachment inflicted by modern materialism, highlighting the tragedy of the contemporary individual who feels increasingly alienated and adrift.

Through powerful symbolism, his poetry gives the **DHARTI** a voice and a body a personified being those shares and suffers alongside human crises. The **DHARTI** becomes a mirror reflecting our lost connection. Ultimately, this research reveals that Wazir Agha's DHARTI is a plea for reconciliation and return. It offers a deeply humanistic pathway to mend the fractured relationship between the self and the soil, providing a profound sense of continuity that embraces the sorrows of the past while grounding the hopes for a sustained human future.

Keywords: Dr. Wazir Agha, Concept of DHARTI (دھرتی), Human Experience, Collective Consciousness, Modern Alienation, Civilizational Roots, Spiritual Void, Symbolism,

شاعری کے ذریعے تصورات اور محسوسات کو منتقل کرنا لفظ کے ساتھ تخیر کو مربوط کرنے پر منحصر ہے۔ انسان کا اجتماعی شعور لاشعور لامحدود وسعتوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے واقعات کو لفظ کی صورت میں اس طرح ادا کرنا، کہ وہ تخلیق کار کے ساتھ خود اپنا تزکیہ بھی کرے۔ کوئی بھی شاعر اپنے تخلیقات میں نئے موضوعات کو شامل نہیں کرتا، بلکہ موجود کو انفرادیت دیتا ہے، اس کی یہ انفرادیت تخلیقی طور پر فکری نظام سے اخذ ہوتی ہے، جس کے لیے ادراک کا ہونا از حد ضروری ہے۔ وہ جہاں ایک فکر کو دریافت کرتا ہے وہاں اس کی اکائی کو اجتماع سے جوڑتا ہے، جمالیاتی حظ سے اس کو قابل قبول بناتا ہے۔ شاعر محض عشق محبت کے گیت یا لفظ اور خیال کا رشتہ تخلیق نہیں کرتے، بلکہ زندگی کے تمام تر نشیب و فراز کو موضوع بناتے ہیں۔ لفظوں کے ذریعے انسانی زندگی کا وجود پیکر میں نہیں ڈھل سکتا۔ خیال کو تصور تک اور تصور کو مادے کی صورت دینے تک مختلف کیفیاتی عوامل تخلیق کرنے پڑتے ہیں۔ جن میں شاعر کا ذوق اہم کردار ادا کرتا ہے۔

نظم میں غزل کی نسبت خیال کو تقویت دی جاتی ہے۔ اظہار کی راہ میں کئی موڑ آسان ہو جاتے ہیں۔ طبعی رجحان، عہد حاضر کے روایات ہر طرح کے داخل اور خارج کی کیفیات کو بیان کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ نظم تخلیق کار کے داخلی کیفیات کا اظہار ہے۔ تخلیق کار ایک مرکزی خیال کے ابلاغ کے لیے پورا ماحول تخلیق کرتا ہے۔

"نظم فرد کی ذات کا ائینہ ہے"۱

ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظم اپنے ارتقا سے تاحال تخلیق کار کے تجربات کا عکس ہے۔ جو ایک کہانی ہے، اس میں کسی بھی خاص موضوع کے ساتھ وابستگی نظر آتی ہے مثلاً نظیر کی نظموں میں سماجی زندگی، تہواروں کا ذکر، حالی اور اسماعیل میرٹھی کے ہاں فطرت کا اور اقبال کے ہاں وطن پرستی راشد داخلی کرب اور میراجی کی شاعری میں دھرتی پوجا کا ایک گہرا تصور ابھرتا ہے۔ دھرتی کا تصور، اصل میں انسانی، تہذیبی زندگی اور اجتماعی لاشعور کا گہرا حوالہ ہے۔ میراجی کے بعد نظموں میں دھرتی سے وابستگی کا پہلو ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں بھی ملتا ہے ان کا تخلیقی تصور تاریکی سے روشنی کی جانب سفر کرتا ہے۔ وہ مظاہر فطرت کو اظہار کی راہ میں مختلف کیفیتوں سے وابستہ کرتے ہیں، اور ان کو علامتی پیرائے میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے متنوع انسانی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ وہ انسانی نفسیات و تجربات میں جامد صورت پیدا نہیں کرتے، بلکہ ان کیفیات کو متحرک بناتے ہیں۔

ان کے ذہن میں ۲۰ ویں صدی کے جدید رجحانات کے اثرات واضح تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں دیگر موضوعات کی نسبت دھرتی کا تصور سہل نہیں، وہ ثقافت کے عوامل کے انضمام پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقات میں دھرتی سے وابستگی فطری ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اظہار کی راہ میں کسی قسم کی مصنوعیت کو نہیں اپنایا۔

دھرتی کا یہ تصور انسان اور اس کی روایات سے جوڑتا ہے۔ یہ خیال انسانیت کا خیال ہے انہوں نے یونگ کے اجتماعی لاشعور کو تہذیب و تاریخیں مضمرات میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہیں۔ وسیع عرضی تناظر ان کی نظموں میں زندگی کو تقویت دیتا ہے۔ ان کی نظمیں اس حوالے سے بہت اہم ہے جس میں انہوں نے انسانی تہذیب کے ادوار اور دھرتی کے ساتھ اس کی وابستگی کو خوبصورت انداز میں تخلیق کیا ہے۔ انسان کا زمین پر آبادی کی صورت میں ڈھلنا جنگل اور بیابانوں کا رخ کرنا مختلف تہذیبوں میں شامل ہونا، اور پھر مشینی زندگی کی یلغار کا آنا، انسانی لالچ کو تقویت ملنا، ان سب رجحانات نے ان کو دھرتی سے جوڑا۔

تم بھی جاگو تم کن میٹھے سندر سپنوں میں غلتاں ہو

آنسو کی باریک ردا سے جھانک کے دیکھو بستی پنکھ سوار رہی ہے"۲

بستی کے اس تصور کے تحت انھوں نے انسانی المیوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ وہ جدید زندگی میں انسانی زندگی پر مادی اثرات کو دھرتی کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ فطرت سے دوری انسان کو نہ صرف خوبصورتی اور سکون سے محروم کر رہی ہے بلکہ اس زندگی میں بے چینی اور اضطراب بھی پیدا کر رہی ہے۔ وہ اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ انسان نے ترقی کی دوڑ میں فطرت کے ساتھ اپنے قدیم اور گہرے تعلق کو کھو دیا ہے۔ انسان نے ارضیت سے تعلق میں دوری پیدا کر کے روحانی اور جذباتی خلا پیدا کیا۔ یہ خلا زندگی میں بے چینی اور افسردگی کا سبب بنتا ہے ان کے نزدیک ارضیت کے تصور کے تحت انسان کا المیہ ایک گہری اور معنی خیز حقیقت ہے، انسان کا تہذیبی مقام ایک پیچیدہ اور عمیق موضوع ہے۔ جدید دور کا انسان تہذیبی طور پر کئی مسائل اور چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے، اور ان کی شاعری ان تہذیبی مسائل کو اجاگر کرتی ہے۔ انسان جدید تہذیب کے نام پر اپنے قدیم اور فطری اصولوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ انسان نے ترقی اور جدت کے چکر میں اپنے تہذیبی ورثے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ انحطاط انسان کو روحانی اور اخلاقی بحران کی طرف لے جا رہا ہے۔

"کہیں دور دھرتی پگلی ہوئی جلد سے

کالے گنجان جنگل نکل کر

ہر اک چیز کو اپنے سایوں سے ڈھانپیں دھوئیں کے سندیسوں کو

کالی ردا میں چھپائیں

بڑی دور تک اپنے پر چھائیوں میں انوکھا سا ایک خوف پھیلائیں ہیں"۳

وہ مزید لکھتے ہیں،

"فضا پر بجھی گھر د کھا سائیں بائیں

زمین آج پھیلا ہوا خاندان ہے"۴

ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری میں ارضیت کے تصور کے تحت انسان کا تہذیبی مقام ایک مرکب اور اہم موضوع ہے۔ ان کی نظموں میں یہ احساس بار بار ابھرتا ہے کہ انسان کو اپنی تہذیب کو بچانے، اسے مضبوط کرنے، اور اسے فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی شاعری اس بات کی عکاس ہے کہ انسان اپنی تہذیب کی تعمیر نو کے ذریعے ایک بہتر اور پائیدار مستقبل کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو زمین، فطرت، اور دیہی زندگی کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ارضیت صرف قدرتی مناظر یا دیہی زندگی کی عکاسی تک محدود نہیں، بلکہ اس میں انسانی تاریخ کے مختلف مراحل اور تہذیبی ارتقاء بھی شامل ہیں۔

"کبھی آسماں ایک صحرا تھا!

کبھی

آسماں ایک صحرا تھا

سمن زمانوں سے آزاد

سویا پڑا تھا

مگر آج..... کوئی بتاؤ

اُسے کیا ہوا ہے؟

کہ وہ کترنوں، دھجیوں، خون آلود مچھوں میں

بٹ کر ہے

یہ رنگ بیٹوں میں ڈھل کر

زمیں پر اُتر آنے لگا ہے

زمیں اُس کے بھاری پیروں کے تلے

دم بخود

خوف سے کانپتی

اپنے اندر ہی اندر

سمٹی چلی جا رہی ہے!"۵

عہد عتیق کا انسان فطرت سے منسلک تھا۔ اس کے ہمراہ کئی سائے تھے۔ ان سایوں سے مراد انسان کے من گھڑت توہمات، عقائد، دیوتا اور ٹیبوز شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ انسان غاروں سے میدان، میدان سے پکے مکانات اور مکانات سے اونچی اونچی عمارتوں میں رہنے لگا۔ پھر طاقت اور گھمنڈ کے گھمنڈ میں اپنے سے کمزور ملکوں اور قوموں کو نشانہ بنا کر فتح یاب ہو کر نئی تہذیب کا نمائندہ بن کر ابھرا، لیکن اس کا رشتہ فطرت سے کٹ کر رہ گیا، کبھی یہ انسان سادہ مزاج اور نیک سیرت ہوا کرتا تھا، مگر تہذیب کے بھیانک روپ نے اسے وحشی اور درندہ صفت بنا دیا۔ نظم میں ایک طرف انسانی تہذیب کا مثبت پہلو بیان کیا گیا ہے لیکن بباطن اس کے مضر اثرات بھی نمایاں ہیں۔

یہاں خشک ندیوں کی سوکھی زبانیں
بجھی بانجھ دھرتی کے چھاتی سے چمٹی ہوئی ہے
برہنہ درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتے اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر عجب بے بسی سے
خشک ریت کی میلی چادر پہ اوندھے پڑے ہیں"٦

دھرتی کا تصور ان کے یہاں اسلوب و موضوع کی سطح پر گہری رمزیت پیش کرتا ہے۔ انہوں نے ارضیت کے خیال کو سادہ پیرائے میں تخلیق کرنے کی بجائے اس کے لئے اشاروں کنایوں اور علامتوں کے استعمال سے معنی کو مزید وسعت بخشی ہے۔ وہ خود زمیندار تھے، اور دھرتی کی خوشبو کو وہ وجود کا حصہ تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک ارضیت کا تصور انسانی تہذیبی و تاریخی زندگی کے تسلسل کو سامنے لاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نظموں میں جہاں کہیں دھرتی کا تصور دیا اس میں انسانی تہذیبی زندگی اور تاریخی حوالے اہم تھے ۔

ایک البیلی پگڈنڈی ہے
افتاں خیزاں، گرتی پڑتی، ندی کنارے اتری ہے
ندی کنارے باہیں کھولے ایک البیلا پیڑ کھڑا ہے
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیراں کھڑی ہے
جسم چرائے آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے
جانے کب سے بانہیں کھولے، رستہ روکے پیڑ کھڑا ہے
جانے کب سے
جسم چرائے آنکھ جھکائے پگڈنڈی حیراں کھڑی ہے"٧

پگڈنڈی اور پیڑ کا تعلق تاریخی طور پر نسل در نسل ایک تصور کے طور پر منتقل ہوتا آرہا ہے، تاہم موجود دور میں جب دھرتی کا تصور جدید رویوں کو اپنانے سے بدل رہا ہے ان کے مابین تعلق بھی حیرت پر مبنی ہو گیا ہے انسان کا اپنی ذات کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان سے تعلق اب حیرت کا استعارہ ہے، ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں داخلی طور پر سہل نہیں بلکہ قاری کو ان خیالات کو ممکنات میں لانے کے کے لئے دھرتی کے تصور سے آشنا

ہونا ہو گا ان کی شاعری میں یہ رجحان محض ایک تصور نہیں، بلکہ اس کے کئی پس منظر ہیں جس میں شاعر اس کے جذبات اور خارج کے تصورات اسلوب و موضوع دونوں کی ہم آہنگی سے معنی کو جنم دیتے ہیں، انہوں نے نظم تہذیب میں انسانی تاریخ کے المیے کو دھرتی سے جوڑ کر ایک ایسے تصور کو انفرادیت بخشی، کہ جس میں فرد اپنی اصل سے جڑ کر تینوں زمانوں کے روایات کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہا ہے گزشتہ زمانہ موجود سے اور آنے والے وقت سے کن صورتوں میں بدل رہا ہے اس کا بہترین حل انہوں نے ارضیت کے تصور سے دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں میں دھرتی کا تصور محض زمین کے کسی حصے تک محدود نہیں، بلکہ انہوں نے انسانی بستی کے طور پر اس تصور کو وسیع تر معنوں میں پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ دھرتی سے ان کا عشق بہت گہرا ہے انہوں نے اردو شاعری میں اس تصور کو انفرادیت دی۔ ان کی نظموں میں دھرتی کا تصور انسانی کی تخلیق سے جڑا ہے جب انسان اس دنیا میں نہیں تھا تب بھی دھرتی کا وجود تھا پھر انسان نے اس کو آباد کیا، انسان نے لفظ و حرف کے ذریعہ اس کے وجود کو بیج کی صورت بویا، انہوں نے لفظ و حرف کو دھرتی کا معنی قرار دیا ہے۔

یہ کس پاگل مصور نے
زمیں کو کینوس اپنا بنایا ہے
ستاروں کے ہزاروں مو قلم ٹوٹے پڑے ہیں
ہزاروں رنگ جس نے
مہرباں خورشید کے پیلٹ سے لے کر
زمین کی کھوپڑی پر مل دیئے ہیں
جزیرہ سرخ
صحرا سبز
قلزم زرد رو جس نے دکھائے ہیں ۔۸

جس طرح مختلف رنگ انسانی نفسیات کو اپنی جان متوجہ کرتے ہیں۔ اس طرح وزیر آغا نے دھرتی کے مختلف رنگوں کے ذریعہ زندگی کینوس کو تخلیق کیا۔ شاعر کے تخیل نے زمین کو دیکھ کر سمندر پہاڑ دریا اور زمین کے مختلف حصوں کو بیان کیا۔ ان کی فکری جہد کسی بھی حوالے سے اپنے ماحول اور زمان و مکان سے خارج نہیں ان کی تخلیقات میں نسلی تجربات نسل انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہے وہ اپنے ماحول سے ہٹ کر امکانات کی دنیا میں نہیں رہتے ان کی نظموں کی دنیا اسلوبیاتی اور موضوعاتی دونوں سطح پر دھرتی تہذیب کی آمیزش ہے وہ زندگی کے تجربات سے نکل کر دوبارہ تجربہ کرنے کی طاقت حاصل کرتے ہیں۔

خاک کیا تھا
ابدی نیند اگر ہوتی وہ
اُڑ جاتی یہ اپنا مرغِ نشان
زمیں پر چھوڑ کے جاتی
پانی کی ہر بوند تو بس

اُڑنے کے لیے ہی آتی ہے

تم اُس کا نشان کہاں ڈھونڈو گے

جی مانے تو چپکے سے

بس میری بھیگی بھیگی آنکھوں میں اک بار

لپک کر آجاؤ

پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے"۹

نظم کا مزاج بظاہر علامتوں و استعاروں پر مشتمل ہے تاہم شاعر ایک ایسی فضا تخلیق کر رہا ہے کہ جس میں دھرتی کی تہذیبی تاریخ کے ساتھ یہ بھی بیان کیا جائے کہ کس طرح دھرتی اپنی شناخت اور وجود کے ارتقاو تسلسل کے لئے ہمہ تن گوش ہے، اس کو جدید عہد کے سامراجی و مادی دنیا سے بھی نبرد آزما ہونا ہے اور ماضی کے آدرشی لمحات کو بھی ساتھ رکھنا ہے۔ انسان کا زمین پر آنا اور آبادی کی صورت میں جنگل اور بیابانوں کا رخ کرنا، سماجی زندگی میں شامل ہونا اور پھر مشینی زندگی کی یلغار انسانی حسی حرس لالچ کو تقویت دیتا ہے۔ ان سب مشاہدات اور تاریخ کے اہم اوراق کو انہوں نے دھرتی کی زندگی سے جوڑا۔ ان کی یہ نظم شاعرانہ انداز میں دھرتی کا نوحہ ہے ان کے نزدیک انسانی زندگی سماج روایات سب دھرتی کے وجود سے ممکن ہے ان کی شاعری میں تصور ارضیت تجریدی بھی ہو جاتا ہے، جو تصور ہی تصور میں نمو پاتا جاتا ہے اور شاعر اس میں کئی ادوار کا سفر کر لیتا ہے، دھرتی سے محبت ان کے تصور عشق کا ایک باب ہے جس میں ان گنت لب و لہجے آجاتے ہیں وہ ان کے ابلاغ کے لئے انسانی رشتوں، سماجی قدروں، تہذیبی ادوار، اور انسانی نفسیات کے مطالعہ سے دیکھتے ہیں ۔

وہ گم سم اندھیرا

دھوئیں کا وہ بے نام دھبہ

کسی بند جادو کی بوتل سے باہر نکل کر بجھی بانجھ دھرتی کی صورت

تیری کورا نکھوں کے اگے اگر اج پھیلا ہوا ہے تو یہ تیری خطا ہے

عجب ماجرہ ہے

اندھیری کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہے

بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہوں"۱۰

انہوں نے نظم میں مختلف علامتوں سے ثقافتی عوامل کو اجاگر کیا ہے ان کی تخلیقات میں سائنس، جدید علوم یا جدید انکشافات کے حوالے سے منفی رجحان نہیں ملتا۔ ان کے نزدیک انسان کی مصروفیت میں اس کی زندگی میں تیزی بربادی ہے اب وہ ہر کام میں جلدی چاہتا ہے اس کو شارٹ کٹ کا عادی بنایا گیا، اگر صنعتی و مشینی ترقی نے دھرتی کے تصور کو کمزور کر دیا تو اب انسان کے پاس تہذیبی جڑیں بھی موجود نہیں بلکہ مادیت پرستی کا ایسا جال موجود ہے جس میں دل نہیں دھڑکتا انسان مقامی ثقافت کو بھول کر عالم شناخت کی جانب بڑھ رہا ہے ۔

"ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں کا محور انسان کائنات

اور سماج کی علائی تثلیث ہے "۱۱

وزیر آغا کے نزدیک جدید عہد کے انسان نے ذہنی طور پر دھرتی کو بانجھ تسلیم کر لیا ہے انسانی تہذیبی ثقافت میں وہ روایات جو سوئمبر ریکھا ،رمضان عید پر ہوتی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔اب وہ موجود نہیں ہے تہذیبی روایت کا تصور پسپا ہوتا جاتا ہے۔

زمانہ کی روانی فقط واہمہ ہے

ہر ایک شے

خود اپنی جگہ پر

خنوطی ہوئی لاش ہے

وقت کی منجمد قاش ہے

وقت ٹھہرا ہوا ہے!۱۲

ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں میں ارضیت سے والہانہ لگاؤ ان کے تصور عشق کے افکار میں بھی شامل ہے انہوں نے عشق کے پیمانے کو محدود نہیں رکھا، بلکہ داخل و خارج میں وہ یکساں احساسات سے تشکیل پاتا ہے ۔

صدیوں تم نے اس کو چاہا

اس کی سیمیں انگلی تھامی چلنا سیکھا

اس کے ٹھنڈے نوارنی چھتنار کے نیچے گھاس ہے لیٹے "۱۳

ان کے انسانی احساسات کا ہر رخ تہذیب کے دھارے سے نکل کر وقت موجود میں شامل ہے،یہی وجہ ہے کہ ان کا عشق لمحہ موجود میں ہو کر بھی کئی صدیوں سے سفر میں ہے۔ان کے ہاں داخلی کیفیات کے اس وسیع ابلاغ کے لئے کئی طرح کی علامتیں موجود ہیں، جس میں ایک ماں کا تصور بھی ہے یہ ماں ہر روپ میں ارضی وابستگی کی تفہیم ہے اس کے ساتھ انہوں نے انسانی رشتوں کی تمام قدروں میں زمینی فطرت کو مقدم رکھا ۔ ان کی تخلیقی کاوش دھرتی سے انصلاح کی جانب مائل ہے۔جس میں وہ انسانی داخلی وہ خارجی سورتوں کو مقدم رکھتے ہیں۔وہ چاند سورج ستارا اور صبح و شام جیسی علامات کا استعمال کر کے زندگی کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں جو ان کے تخیل میں موجود ہیں،اس خاص خوبی کی وجہ سے ان کی شاعری میں ناسٹلجیائی رویے شامل رہے ہیں۔

شام تری مہکار عجب ہے

دور افق سے آنے والا

ہر آوارہ حال پرندہ

تیری نازک شاخوں مخمل پتوں کی خواہش میں

کتنا ظالم کس درجہ خون خوار ہوا ہے

شام پرندوں کی------سے لڑتے لڑتے

تیرا بھی کیا حال ہوا ہے "۱۴

پرانی قدروں کی بازیافت اور یادیں ان کی نظموں میں جہاں تموج پاتے ہیں۔ وہاں پر ان کی داخلی کیفیات دھرتی کی جڑوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ ان کی تخلیقی نظام میں علامتیں اور استعارے فکری یگانگت سے جڑے ہیں۔ وہ ان کے ابلاغ میں کہیں بھی عدم تسلسل کو اختیار نہیں کرتے بلکہ نظم کا موضوع ہی ایک تہذیبی رویے کا ابلاغ کرتا ہے

اندھیرے کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہیں

بانجھ دھرتی کی بھاری سے چمٹا ہوا ہوں"۱۵

نظم کینوس میں انہوں نے دھرتی کے لئے کھوپڑی کا لفظ استعمال کیا۔ دیکھا جائے تو ایک لفظ انسانی تاریخی و نفسیاتی کئی حوالوں کو کھولتا ہے زمین کے کینوس کو دیکھ کر وہ مختلف رنگوں پہاڑ، دریا، زمیں عرض مکمل گلوب کا تخیل کرتے ہیں ان وسعتوں میں وہ اس دھرتی کا ادراک کرتے ہیں جو ان کی فکری و تخیلی امکانات میں موجود ہیں وہ زندگی کے گوناگوں تجربات سے نکل کر اور تجربہ کرتے ہیں ۔

"زندگی کے گریزیا لمحات سے منسلک ہونے کے رجحان نے ڈاکٹر وزیر آغا کے

ہاں لمحے کی قید کے احساس کو بھی قوی سے قوی تر کر دیا ہے"۱۶

نظم "بتا آئے شہر" ان کی تخلیقات میں، دھرتی کے تصور کو محض جغرافیائی حدود سے نکال کر ایک تجسیم شدہ (Personified) ، سانس لیتی ہوئی ہستی کے طور پر پیش کرتی ہے۔ شاعر دھرتی کے شہر کو "بتا اے شہر تیری مہم رہن تک" کہہ کر ایک ایسی حتمی پناہ گاہ قرار دیتا ہے جو اپنے اندرونی کرب کو اپنی مادی ساخت سے ظاہر کرتی ہے۔ اس نظم کا مرکزی استعارہ "مکانوں کی بجھی آنکھوں میں کالا موتی اُترا ہوا ہے" ہے، جہاں عمارات، جو دھرتی کی جسمانی توسیع ہیں، اجتماعی غم اور ظلم کے آنسو روتی نظر آتی ہیں۔ یہ "کالا موتی" نہ صرف ویرانی بلکہ دھرتی کے احساسِ زیاں (Internalized Grief) کو علامت دیتا ہے۔

یہاں انسانی تجربہ براہِ راست دھرتی کے وجود میں جذب ہو جاتا ہے۔ جب "ڈری سہمی ہوئی مخلوق دیواروں کے اندر چھپ گئی ہے"، تو دھرتی خود کو ایک ایسی ماں کی صورت میں پاتی ہے جو اپنے خوفزدہ بچوں کو پناہ دینے سے قاصر ہے۔ امید کا انقطاع "فلک سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے" کے ذریعے واضح کیا گیا ہے، جو دھرتی کی مکمل تنہائی اور مایوسی کو بیان کرتا ہے۔ ظلم اور مصیبت کا حملہ بھی جذباتی اور طبعی دونوں طرح سے ہوتا ہے، جب "وہ شانا" (قوت یا مصیبت کی علامت) دھرتی کے محفوظ کردہ مقامات کو توڑ کر "بجھی آنکھوں کے رستے" داخل ہوتا ہے۔

بتا اے شہر

تیری نیم روشن تنگ

بل کھاتی گلیوں میں

یہ کیسا تعفن بھر گیا ہے

مکانوں کی بجھی آنکھوں میں

کالا موتی اُترا ہوا ہے

کوئی چھت پر نہیں جاتا

فلک سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے

ڈری سہمی ہوئی مخلوق
دیواروں کے اندر چھپ گئی ہے
کوئی آواز تک آتی نہیں ہے

وہ سناٹا
جسے تو نے کبھی گلیوں میں
آنے کی اجازت تک نہیں دی تھی
مکانوں کی بجھی آنکھوں کے رستے
جھکتے ہوئے کمروں کے اندر آ گیا ہے
بتا اے شہر تیرے تن بدن کو
کیا یہ بیٹھے بٹھائے ہو گیا ہے"۱۷

مکانوں کی بجھی آنکھوں" میں اترا ہوا "کالا موتی" محض المیہ نہیں، بلکہ جمود اور دانشورانہ تاریکی (Intellectual Stagnation) کی علامت ہے۔ جب شہر کے باسی خوف کے مارے "دیواروں کے اندر چھپ" جاتے ہیں اور "کوئی آواز تک آتی نہیں ہے"، تو دھرتی اپنے اندر مکالمے اور اظہارِ رائے کی موت کو محسوس کرتی ہے۔ یہ خاموشی اس بات کا تحقیقی ثبوت ہے کہ دھرتی کا سیاسی ماحول خوف اور جبر سے اس قدر بوجھل ہو چکا ہے کہ اب کوئی تخلیقی یا تنقیدی آواز باقی نہیں رہی۔

نظم کا اہم ترین موڑ "فلک سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے" میں ہے، جو دھرتی کی صرف امید سے نہیں، بلکہ عدل اور انصاف کے آفاقی اصولوں (Universal Principles of Justice) سے بھی کٹ جانے کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ستم جو دھرتی کو غیر مرئی طور پر ڈھانپتا ہے، "وہ سناٹا" کی صورت میں مجسم ہو کر آتا ہے، جسے کبھی "آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی"۔ یہ نادیدہ حملہ، کسی بیرونی یا نامطلوب قوت کے ناجائز غلبے کو ظاہر کرتا ہے جو "جھکتے ہوئے کمروں" میں داخل ہو کر دھرتی کی داخلی سالمیت (Internal Integrity) کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

بالآخر، دھرتی کا "تن بدن" ایک "بیٹھے بساطے" میں بدل جاتا ہے، جو طاقت کے کھیل کو پُر فریب اور پُر کشش انداز میں دکھانے کا استعارہ ہے۔ یہ اختتام دھرتی کے تصور کو محض تہذیبی روایات سے بلند کر کے ایک ایسی فکری بساط بنا دیتا ہے، جس پر مادیت پرستی کا کھیل کھیلا جاتا ہے، اور دھرتی خاموشی سے اس ظلم کو اپنے جسم پر سہتی ہے۔

حوالہ جات:

۱: ڈاکٹر وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۲۰۰۶
۲: ڈاکٹر ڈاکٹر وزیر آغا، نظم، شام اور سائے، جدید ناشرین چوک اردو بازار لاہور ۱۹۶۴ صفحہ ۴۷
۳: ایضا
۴: ایضا ص ۵۶

۵:ڈاکٹر وزیر آغا، دیکھ دھنک پھیل گئی ص ۵۵/۵۶، مکتبہ جدید پریس لاہور ۲۰۰۳

۶:ص،۱۳۸

۷:ڈاکٹر وزیر آغا، نظم میں اور تو، شام اور سائے، جدید ناشر چوک اردو بازار لاھور ۱۹۶۲۸

۸:ڈاکٹر وزیر آغا، شام اور سائے، ص ۶۲، جدید ناشرین چوک اردو بازار لاہور ۱۹۶۴

۹:ڈاکٹر وزیر آغا، دیکھ دھنک پھیل گئی ص ۳۰، مکتبہ جدید پریس لاہور ۲۰۰۳

۱۰ڈاکٹر وزیر آغا، نظم عفریت شام اور سائے، ص ۳۱، جدید ناشرین چوک اردو بازار لاہور ۱۹۶۴

۱۱:ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم صفحہ نمبر ۷ مرتبہ غلام حسین اظہر مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا مارچ ۱۹۷۴

۱۲:ڈاکٹر وزیر آغا، دیکھ دھنک پھیل گئی ص ۶۰، مکتبہ جدید پریس لاہور ۲۰۰۳

۱۳: نظم ایک خواب

۱۴: نظم شام

۱۵:عفریت

۱۶:ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں مرتب غلام حسین، ص ۱۲، اظہر مکتبہ اردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا مارچ ۱۹۷۴

۱۷:ڈاکٹر وزیر آغا، چٹکی بھر روشنی ص ۲۹/ ۳۰، کاغذی پیراہن لاہور، ۲۰۰۵